ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب، لاہور

ج (۱) خلافت راشدہؓ کے بعد جب ملوکیت کا دور آیا تو اس تبدیلی سے زوال کا ایک انداز پیدا ہو گیا تھا جسے روکنے کے لیے علماء حقہ نے قانون مدوّن کر کے سلاطین و اُمراء کو اس کا پابند بنانا چاہا اور اس وقت تک سلاطین سے تعاون نہیں کیا جب تک قانون مدوّن نہ ہو گیا۔ اسے لوگ عدم تعاون سے تعبیر کرتے ہیں مگر تعاون میں یہ تامل اس لیے تھا کہ اگر قانون کے مدوّن ہونے سے پہلے سلاطین سے تعاون کیا گیا تو قانون کی بالادستی مجروح ہو گی اور سلاطین کی رائے کو برتری ہو گی۔ قانون کی تدوین زوالِ سیرت کو روکنے کے لیے ضروری تھی کیونکہ انفرادی زندگی میں اخلاق مصلحت بن رہا تھا اور معاشرتی زندگی میں نسلی تفاخر خود پسندی عربی و عجمی کا امتیاز آقا و غلام کا امتیاز اور حاکم و محکوم کا امتیاز غالب آنے لگا تھا لیکن اسلامی اقدار مٹی نہیں تھیں اس لیے سلاطین کے اقتدار کی بدولت قانون کو قوت نافذہ میسر تھی اور علماء کی ذمہ داری قانون سازی کے ذریعے اقدارِ حیات کی حفاظت تھی۔

مگر جب سلاطین کی نوازشات کی بدولت علماء میں شریعت کی بجائے تشریع (لفظِ قانون کی پیروی) کا نقطۂ نگاہ پیدا ہوا تو احکامِ شریعت کی اتباع میں خلوص ناپید ہونے لگا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے صوفیاء نے تزکیے کی خاطر طریقت پر زور دیا اور مسلم معاشرے میں شریعت و طریقت دینی زندگی کے دو مظہر بن گئے۔ جب تک سلاطین اقتدار سے اور قانون قوتِ نافذہ سے محروم نہیں ہو گئے قانون سازی کے ذریعے اقدارِ حیات کی حفاظت کی جاتی رہی لیکن انسان کی مجبوری یہ ہے کہ جب مؤثراتِ زندگی یعنی علمِ اخلاق مذہب، معاشرت، معیشت، سیاست اور بین الاقوامی زندگی بدل جائیں تو جو تدبیر اقدار

یات کی حفاظت کے لیے اس تبدیلی سے پہلے وضع کی گئی تھی اُس کی خلاف ورزی کے
غیر زندگی کے تقاضے پورے ہونے بند ہو جاتے ہیں اس صورتِ حال میں فقہائے اسلام
جتہاد کے ذریعے طریقِ کار میں وہ تبدیلی لانا چاہتے ہیں جس سے انحراف کی راہ اختیار کرنے
لوں کو روکا جا سکے مگر ہمہ گیر اجتہاد اور فقہی اجتہاد میں فرق ہے اگر مؤثراتِ زندگی بدل جائیں،
ورزندگی کے تقاضے انحراف کے بغیر پورے ہونے بند ہو جائیں تو فقہی اجتہاد اس لئے
بے اثر ہو جاتا ہے کہ قانون کی پیروی کی آرزو ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب مسلم معاشرہ عالمی
سطح کے معاشی انقلاب سے دوچار ہوا تو غالب معاشی نظام کی رُو سے تخلیقی جدوجہد کا تعطل
حلت و حرمت ربا سے صرفِ نظر کئے بغیر رفع نہ کیا جا سکا۔ اس صورت حال
میں معاشی تخلیقی جدوجہد کے تعطل کو رفع کرنے کے لئے ربا کو منافع کہنے کا اجتہاد
انحراف سے نہ بچا سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ تخلیقی جدوجہد کے تعطل کو رفع کرنے کے لیے
قرآن نے جو قرضِ حسنہ کو فرض عین قرار دیا تھا اسے مذہبی ذہن نے انفرادی ملکیت
کے سرمایہ دارانہ تقدس کی خاطر مستحب قرار دیدیا۔

اندریں صورت جو اجتہاد اس صورتِ حال کا علاج تھا وہ قرض حسنہ کو لازم کرنے سے
ممکن تھا جسے فقہی اجتہاد کی کم نگاہی زندہ نہ کر سکی۔

ج (۲) اجتہاد قانون سازی کے اندر جو نقص ہوتا ہے اس کو رفع کرنے کے لیے
ضروری ہوتا ہے لیکن اگر تاریخی انقلاب نے اقدارِ حیات کو باقی ہی نہ رہنے دیا ہو
تو قانون کا وظیفہ اقدارِ حیات کو پیدا کرنا نہیں، بلکہ قانون صرف ان کی حفاظت کر
سکتا ہے بشرطیکہ اقدار مٹی نہ ہوں اور قانون کو قوتِ نافذہ میسر ہو۔ اگر اقدارِ حیات مٹ
گئی ہوں تو وہ قانون سازی سے زندہ نہیں ہو سکتیں انھیں دوبارہ پیدا کرنے کے
لئے وہی طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا جس سے وہ پہلے پیدا ہوئی تھیں اور وہ قانون سازی نہیں
تھا بلکہ اصلاحِ زندگی کے ضامن نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے سے وہ اقدا۔

پیدا ہوئی تھیں۔ اس بات کو سمجھ لیں تو فقہی اجتہاد اور فکری اجتہاد میں امتیاز واضح ہوگا۔

ج (۳) اوامر و نواہی کی ایسی تشکیل جس میں ان کی پیروی سے اقدار حیات محفوظ ہو جائیں اور ان کے خلاف ارتکاب کی راہ مسدود ہو جائے۔ اجتہاد کہلائے گی۔

ج (۴) قیاس و استنباط کی دو حیثیتیں ہیں ایک تمثیلی اور دوسری استحسانی قرآن و سنت کے احکام کی تعبیر میں یا تمثیلی قیاس و استنباط کو اختیار کیا گیا ہے یا استحسانی۔ اگر قانون کی اصلاح نصب العین کے حوالے سے قانون کے مطابق زندگی کو منضبط و منقاد بنانے کے لیے کی گئی ہوتی تو قرآن و سنت کے احکام کی تعبیر میں دونوں قسم کا قیاس و استنباط بیک وقت کارفرما ہوتا اور قرآن و سنت کے احکام کی تعبیر کو اجتہاد سمجھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

ب۔ سنت قرآن کے احکام کے عین مطابق عمل کے نمونہ کمال کی حیثیت رکھتی ہے اگر ہم نے سنت کو مآخذِ قانون سمجھا ہوتا اور اس کے ماخذِ قانون ہونے میں پہلے سنت اور حدیث اور پھر حدیث اور روایت کے درمیان عزیمت کی بجائے رخصت پر عمل کرنے کی خاطر التباس پیدا نہ کیا ہوتا تو سنت سے نہ غلامی کو دوام میسر آتا نہ باندیوں سے جنسی تمتع کا جواز نکلتا۔

ج (۵) اگر ائمہ اربعہ کے دور سے لے کر آج تک مؤثراتِ زندگی یعنی علمِ اخلاق مذہب، قانون، معاشرت، معیشت، سیاست اور بین الاقوامی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑا تو حضرت شاہ ولی اللہ کی رائے سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں لیکن اگر انفرادی زندگی میں مقصدیت کی بجائے بے مقصدی غالب آگئی ہو اور حصول نصب العین کی جدوجہد میں کامیابی پر ایمان باقی نہ رہا ہو اور خواہشات ضبط و انقیاد کی پابند نہ رہی ہوں اور معاشرتی زندگی میں کلمہ طیبہ کی بجائے جغرافیائی وحدت

ونسلی وحدت عمرانی وحدت کے شعور کی اساس بن گئی ہو اور معیشت میں حرص ولالچ اور بخل کے غالب آجانے کی وجہ سے انفرادی ملکیت کا تقدس قائم ہوگیا ہو اور زندگی کے سیاسی پہلو میں ہوس اقتدار اتنی غالب ہو کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نشاندہی ان تطع اکثر من فی الارض یضلوك عن سبیل اللہ کے باوجود کلمۂ طیبہ کی بنیاد پر معاہدہ عمرانی کا وجود میں لانا غیر ضروری متصور ہوتا ہو اور بین الاقوامی سطح پر اسلام کے خلاف دشمنی اتنی شدید ہو کہ اس میں کسی اضافے کی گنجائش باقی نہ رہی ہو اور عالم اسلام کے اندرونی انتشار نے امت مسلمہ کی وحدت کے شعور کو اتنا فنا کیا ہو کہ عالم اسلام ایسی سینتالیس متقدر ریاستوں میں اختلال پذیر ہو کر رہ گیا ہو جو آپس ہی میں محاذ آرائی میں مصروف ہوں اور غیر اسلامی دنیا کی اسلام دشمنی بھی اُن کے اندر اسلامی اتحاد کا شعور پیدا کرنے سے قاصر ہو تو کیا آئمۂ اربعہ کے اجتہاد کی پیروی عالم اسلام کے اس ابتلاء کا مداوا ہو سکتی ہے۔ اگر ہو سکتی ہے تو چشم ما روشن دل ماشاد۔

ج (٦) فقہ اسلامی میں جمود کا اصلی سبب قرآنی اصطلاحات کا مفہوم خود قرآن سے اخذ کرنے کی بجائے لغت سے اخذ کرنا ہے۔ مثلاً کتاب و سنت کے حوالے سے کتاب ایک لکھے ہوئے ضابطے سے زیادہ متصور نہیں ہوتی اگر یہ صحیح ہو تو کافروں پر قرآن مجید کے اس طنز کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ ﴿ھدی ولا کتاب منیر﴾ اگر کتاب لکھا ہوا ضابطہ ہی ہے تو اسے توریت کی تمثیل پر قیاس کیا گیا ہے اور توریت کی تقدیر یہ ہے کہ اس کا پیرو کوئی معاشرہ زوال میں مبتلا ہونے کے بعد نئی بعثت کے بغیر کبھی زوال سے نہیں نکل سکا۔ اس لئے قرآن کو بحیثیت کتاب توریت کی تمثیل پر قیاس کرنے والا ذہن ختم نبوت کی بنیاد پر اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے مایوسی میں

مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ج (۷) ائمہ اربعہ جس ماحول میں اجتہاد کی طرف متوجہ ہوئے تھے اس میں پیغمبرانہ تعلیمات سے پیدا ہونے والی اقدارِ حیات مٹ نہیں گئی تھیں اس لیے اس دور میں قانون سازی کی جدوجہد کتاب و سنت، اجماعِ صحابہ اور قیاس کی بنیاد پر کی گئی تھی اور تکمیلِ دین کا مفہوم تکمیلِ فقہ سمجھا گیا تھا مگر جسے قرآن تکمیلِ دین کہہ رہا ہے وہ تکمیلِ فقہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ فقہی ذہن نے تکمیلِ دین کا مفہوم الیوم اکملت لکم دینکم۔ کے حوالے سے متعین کیا ہے مگر جب ہم پوری آیت پر غور کرتے ہیں یعنی الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشونِ، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ تو تکمیلِ دین اس رہنمائی سے عبارت ہوگی جس میں ولو کرہ المشرکون کے چیلنج کو پورا کرنے کی ضمانت تھی۔ اور وہ رہنمائی فقہی محکمات پر مشتمل تھی بلکہ تکوینی محکمات پر مشتمل تھی اور تکوینی محکمات وہ کائناتی قوانین ہیں جن سے اوامر و نواہی کے اتباع کا ہم آہنگ ہونا اتنا ضروری ہے کہ اگر وہ ہم آہنگی پیدا نہ ہو تو تمام اوامر و نواہی کی پیروی انحراف کے برابر ہو جاتی ہے۔

اندریں صورت آئمہ اربعہ کے اصول اجتہاد اگر یہ ہوں کہ پہلے قرآن پھر حدیث پھر اجماع صحابہ پھر قیاس پھر اجتہادِ نو تو قرآن معاذ اللہ خاکم بدہن پانچویں درجے میں ناقص ماخذ قانون قرار پاتا ہے جس کی کمی پہلے حدیث سے پھر اجماعِ صحابہؓ سے، پھر قیاس سے، پھر اجتہادِ نو سے پوری کی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ امر غور طلب ہے کہ ایسی صورت حال جس میں اقدارِ حیات مٹ رہی ہوں اور قانون سازی موثراتِ زندگی کے بدل جانے کی صورت میں بے نتیجہ ہو گئی ہو تو اجتہاد ہی

بے نتیجہ ہو کر رہ جاتا ہے پھر اس کے اصولوں کے بدلنے نہ بدلنے کا سوال ہی بے معنی ہے۔

ج (۸) جب اجتہاد ہی بے اثر ہو گیا تو مجتہد کے اوصاف عالیہ کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ بلکہ قانون سازی کی بجائے پیغمبرانہ مقاصد کے لیے انقلاب کی احتیاج پیدا ہو گئی ہے۔

ج (۹) فقہی اجتہاد نہیں بلکہ فکری اجتہاد ناگزیر ہو گیا ہے اور اس کا طریقہ صرف کتاب و سنت پر توجہ کو مرکوز رکھنے کے لیے شرک فی النبوت سے اجتناب کو ضروری سمجھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سنت رسول اللہ صلعم کے مقابلے میں کسی شخص کی رائے کو جگہ نہ دی جائے۔

ج (۱۰) جب تک پہلے یہ بات واضح نہ ہو کہ اسلامی ریاست ہوتی کیا ہے تب تک مہابھارت کے برابر ضخیم جواب لکھنا بھی کارآمد نہیں ہو سکتا۔ اسلامی ریاست اسلامی معاشرے کے منظم ہونے سے وجود میں آتی ہے اور اسلامی معاشرے کے خصائص ہیں کہ وہ نوعِ انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو اور اخلاقی جد و جہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو جنکی جد و جہد کا رُخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں اور اس معاشرہ میں استحکام کی اساس محمد رسول اللہ صلعم کی غیر مشروط اطاعت اور آپ کی ذات گرامی سے غیر منقسم وفاداری ہو تنظیم مطیع و مطاع کے وجود میں آنے کا نام ہے جب یہ دونوں وجود میں آجائیں تو مطاع کو قانونی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جبراً بھی اطاعت طلب کر سکتا ہے اگر اطاعت ہوس اقتدار کی تسکین کے لیے طلب کی جائے تو ایک ظالمانہ نظام وجود میں آتا ہے اور فلاحی ریاست کا قیام ناممکن ہو جاتا ہے ایسے مستبد نظام کو روکنے اور فلاحی ریاست کے وجود میں لانے کی شرط یہ ہے کہ

کلمہ طیبہ کی بنیاد پر معاہدۂ عمرانی وجود میں آئے جس کے نتیجے میں مطیع اور مطاع دونوں کے لئے منزل من اللہ احکام یکساں واجب التعمیل ہوں۔ صرف ایسی ہی ریاست کو اسلامی ریاست کہا جائیگا نیز مطاعِ محسوس کے بغیر معاہدۂ عمرانی وجود میں نہیں آسکتا اس لیے قرآن مجید کے اس حکم کی بنا پر اطیعو اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ معاہدۂ عمرانی کا وجود میں آنا ہی اسلامی ریاست کا صورت پذیر ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ساری کائنات کی حاکمیت ہے اور یہ ایک مابعد الطبیعی تصور ہے سیاسی تصور نہیں کیونکہ خدا کی ذات نامشہود ہے اور مطاع نامشہود کے ساتھ معاہدہ عمرانی متصور نہیں ہوسکتا اسی لیے اللہ پاک فرماتا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ صدیق اکبرؓ بھی اپنے آپ کو خلیفۃ رسول اللہ کہتے ہیں اور فقہ کی زبان میں محمد رسول اللہؐ ہی شارع (LAW-GIVER) ہیں اور اسلامی ریاست میں محمد رسول اللہؐ کے علاوہ کسی کا مطاع ہونا ناقابلِ تصور اور ناقابلِ عمل ہے جو لوگ خدائی حاکمیت پر اصرار کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی حاکمیت کے پردے میں رسول اللہ صلعم کے نمونۂ سیاست سے آزاد ہوکر اپنی حاکمیت قائم رکھنا چاہتے ہیں جو شرعاً وعقلاً ہر اعتبار سے ناپسندیدہ ہے۔

مفتی شیخ محمد حسین صدر مؤتمر علماء شیعہ رجسٹرڈ پاکستان مہتمم سلطان المدارس الاسلامیہ سرگودہا

(۱) اسلام میں قانون سازی کا دائرہ

یہ حقیقت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اسلام میں قانون سازی یا بالفاظ دیگر دین سازی کا حق صرف مالک یوم الدین۔ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ لہ الحکم و لہ الامر خداوند عالم نے قانون سازی کا یہ حق نہ کسی نبیؑ رسولؐ

کو تفویض کیا ہے اور نہ ہی کسی ولی و امام کو۔ سرکار خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو
بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ حرامِ خداوندی کو حلال یا حلالِ الٰہی کو حرام قرار دیں۔
" لم تحرم ما احل اللہ لک ۔ " تا بدیگراں چہ رسد؟ آنحضرتؐ بموجب ارشادِ
قدرت " یا ایہا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک " آپؐ مبلغِ دین و ناشرِ
شریعتِ رب العالمین تو ہیں مگر مقنن قانون اور مشرع شریعت نہیں ہیں۔

(۲) اس دائرہ عمل میں اجتہاد کا کیا مقام ہے؟ سابقہ بیان سے اس سوال کا جواب بھی واضح و عیاں
ہو جاتا ہے کہ اجتہاد کے ذریعہ سے کسی شرعی و دینی قانون سازی کا کام نہیں لیا جاتا بلکہ اسکے
ذریعہ سے خدا کے بنائے ہوئے اور پیغمبرِ اسلام کے پہنچائے ہوئے قواعدِ کلیہ کو ان کے
مختلف جزئیات پر منطبق کیا جاتا ہے، اور اس کی مدد سے نئے نئے پیش آمدہ مسائل کے
دلائل قرآن و سنت سے تلاش کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ دینِ
اسلام کامل بلکہ اکمل اور خدا کا آخری پسندیدہ دین ہے۔ ان الدین عند اللہ
الاسلام اور اس دین کے قانون کی کتاب یعنی قرآن مجید میں جمیع ما یحتاج الیہ
الناس۔ کو بیان کر دیا گیا ہے اور حقیقی معلم قرآن یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
قول و عمل سے اس کی تشریح و تفسیر بھی بیان کر دی ہے۔ تاہم اس میں ہر ہر پیش آمدہ
واقعہ کی جزئیات و تفصیلات عامۃ الناس کو نظر نہیں آتیں۔ یہ ایک مجتہد کا کام ہے کہ
ہر دور کے مقتضیات کے مطابق قرآن و سنت کے بحرِ ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کر کے نئے
نئے پیش آمدہ مسائل کے احکام کا استنباط کرے اور ہر ہر جزئی کو اس کی کلی کے ضمن
میں داخل کرے اور اس کلی قانون کو اس جزئی پر منطبق کرے وبس۔

(۳) اجتہاد کی جامع و مانع تعریف

جب سابقہ بیان سے اجتہاد کے دائرہ کار کا تعین ہوگیا ہے تو اس سے اجتہاد کی فی الجملہ تعریف بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ اجتہاد۔ جد و جہد سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی کسی دشوار کام میں کوشش و کاوش کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی ہیں" استفراغ الوسع فی تحصیل العلم او الظن بالحکم یعنی (جامع الشرائط فقیہہ کا) کسی حکم شرعی کا علم یا ظن حاصل کرنے کی خاطر اپنی انتہائی کوشش و کاوش کا بروئے کار لانا" یا بالفاظ دیگر "بذل الطاقة فی تحصیل الوظائف الدینیة" یعنی (کسی فقیہہ کا) اپنا دینی وظیفہ معلوم کرنے میں اپنی ممکنہ طاقت و قوت کا صرف کرنا۔ اس تعریف سے ظاہر ہے کہ اجتہاد کی حیثیت شریعت میں کاشفیت کی ہے۔ اسے موضوعیت حاصل نہیں ہے۔

(۴) کیا قیاس استنباط کے علاوہ قرآن و سنّت کی تعبیر بھی اجتہاد کہلائے گی نیز ماخذ کی حیثیت سے قرآن و سنّت کا باہمی ربط کیا ہے؟

جہاں تک مذہب شیعہ کا تعلق ہے اس کے نقطۂ نگاہ سے قیاس کا ماخذِ قانون ہونا تو بجائے خود سرے سے قیاس ہی جائز نہیں ہے۔ اس مذہب میں گو بطور وزنِ بیت چار ماخذ ہیں (۱) قرآن (۲) سنّت (۳) اجماع (۴) عقل۔ مگر ان سب میں سے مرکزی و بنیادی حیثیت قرآن و سنّت کو حاصل ہے کہ قرآن اصل اور سنّت اس کی تفسیر و تشریح ہے جہاں تک اجماع کا تعلق ہے اس کی حجیت صرف قولِ معصوم کا حاکی یا اس کا کاشف ہونے کی وجہ سے ہے ورنہ اس سے قطع نظر اس کی ذاتی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور جہاں تک عقل کا تعلق ہے یعنی اس بات کا کہ بلا بیان سزا دینا قبیح ہے۔ یا جب کسی چیز کے وجوب میں شک

ہوتو اصل برأت ہے۔ تو یہ بھی اس بنا پر ہے کہ اس کی تائید قرآن وسنّت سے ہوتی ہے ورنہ تنہا اس کی بھی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے اور نہ ہی اس کے بل بوتے پر کوئی قانون بنایا جا سکتا ہے۔ بنابریں قرآن وسنت سے مقررہ طریقہ پر (جس کی وضاحت بعد ازیں کی جائے گی) استنباط واستخراجِ احکام اجتہاد کہلائے گا۔ لہٰذا جہاں قرآن وسنّت کی نص صریح موجود ہو، تو قرآن وسنّت کی تعبیر کو اصطلاح میں اجتہاد نہیں کہا جائیگا اور نہ ہی نص صریح کے بالمقابل اجتہاد کرنا کسی مذہب میں جائز ہے، بلکہ بالاتفاق بمقابلہ نص اجتہاد کرنا حرام اور باطل ہے۔ بہرکیف اصلی وحقیقی ماخذ دو[۲] ہیں ایک قرآن ــــ جسے مرکزی حیثیت حاصل ہے اور دوسری سنّت جو کہ قرآن کی تشریح وتفسیر ہے۔

(۵) کیا اس زمانہ میں آئمہ اربعہ کی رائے کیخلاف اجتہاد کرنا جائز ہے؟ ہاں یقیناً

جائز ہے۔ ہم حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اور دیگر اکابر اسلاف کا احترام کرنے کے باوجود اُن کی اس رائے سے اتفاق کرنے سے قاصر ہیں کہ "اس زمانہ میں کوئی اجتہاد ائمہ اربعہ کی رائے کے خلاف نہیں ہونا چاہیے" اور ہمارے اس اتفاق نہ کرنے کی وجوہ درج ذیل ہیں۔

(الف) سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کوئی آیت یا روایت اس زمانہ میں ایسے اجتہاد کی بندش پر دلالت نہیں کرتی۔ اس لیے یہ دعویٰ بلا دلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے۔

(ب) خود ائمہ اربعہ میں سے کسی امام نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ ان کے بعد ان کی رائے کے خلاف اجتہاد کرنا حرام ہے! بلکہ اس کے برعکس ان کے ایسے اقوال ملتے ہیں جن سے ان کی رائے کے خلاف اجتہاد کرنے کا جواز واضح ہوتا ہے۔ مثلاً

امام مالکؒ کہتے ہیں "میں ایک انسان ہوں جس سے خطاء وصواب دونوں ممکن ہیں میرے اقوال کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھا کرو"۔ امام اعظم فرماتے ہیں" یہ میری بہترین رائے ہے اگر کوئی اس کے خلاف رائے قائم کرے گا تو میں قبول کروں گا" اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں" اگر میرے قول کے خلاف کوئی صحیح حدیث مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر مار دو" اور امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں" میں کلامِ خدا و رسولؐ کے ساتھ اپنے کلام کو نہیں ملا سکتا۔ اس لیے میں فقہ میں کوئی کتاب نہیں لکھوں گا" (امام الصادق والائمۃ الاربعہ) ان حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا دعوی" پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کا مصداق ہے۔ غالباً انہی حقائق کی بنا پر شیخ عبدالعظیم مکی نے اپنے رسالہ" القول السدید" میں اس تلخ حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ" خدا نے کسی شخص کو حنفی یا مالکی یا شافعی یا حنبلی بننے کا حکم نہیں دیا اس نے تو صرف رسولؐ اکرم کی شریعت پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے"۔

(ج) قرآن وسنت کے سمجھنے کی کوشش کرنے کو کس نے ممنوع قرار دیا ہے؟۔

(د) ترقی یافتہ علوم کے سہارے قرآن وسنت سے زمانہ حاضرہ کی ضروریات کیمطابق استفادہ کرنے کو کس نے روکا ہے؟۔

(ہ) کیا ائمہ اربعہ کے بعد پیدا ہونے والے لوگ قرآن وسنت کو سمجھنے کے مکلف نہیں ہیں؟ اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو کیا وہ سب کے سب ناقص العقل والعلم ہیں؟ ان کے مقدر میں یہ نقص کس نے اور کیوں لکھ دیا ہے؟ اور سارا فضل وکمال صرف ان چار بزرگوں میں کس نے منحصر کر دیا ہے؟ انہی وجوہ کی بنا پر علامہ جمال الدین افغانی نے کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ" اگر آج امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد زندہ ہوتے تو ہر حکم کو قرآن وسنت سے نکالتے اور ہر غوطہ زنی سے نئی فکر پیدا کرتے"

(خاطرات جمال الدین افغانی) الغرض یہ دعویٰ چونکہ بالکل بے دلیل ہے اس لیے قابل قبول نہیں ہے۔ اس لیے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ باب اجتہاد کو مقفل کر دینا نہ صرف آزادیٔ فکر پر کاری ضرب ہے بلکہ اصل اسلام پر زبردست حملہ ہے۔ حالاتِ حاضرہ کے پیش نظر اس باب کا کھولنا اشد ضروری ہے۔ اسی لیے مذہب شیعہ کی رو سے بابِ اجتہاد ہمیشہ کھلا رہے گا۔

(۶) فقہ اسلامی میں جمود کا اصل سبب؟

اس جمود وخمود کی کوئی شخص چاہے جو تاویل و توجیہ پیش کرے۔ مگر ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ جو شخص بھی اس کے حقیقی علل وعوامل کا بنظرِ غائر جائزہ لے گا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا۔ کہ اس کا اصلی سبب خالص سیاسی تھا۔ سلاطین

نے اجتہاد کو اس لیے روکا تھا کہ اپنے ملک کو بچائیں، اپنے مدمقابل کو دبائیں اور اگر کوئی مصلح و ریفارمر پیدا ہو تو اس کی آواز اور فکرِ جدید پر پہرے بٹھائیں تاکہ اس کی بات نہ سنی جائے اس لیے وہ فقہ اسلامی جس سے اسلام اور مسلمانوں کی زندگی وابستہ تھی منجمد ہو کر رہ گئی۔ اور اس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ الغرض ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ بابِ اجتہاد کو بند کرنا کوئی شرعی کام نہ تھا بلکہ یہ کام تمام تر سیاسی مقاصد واغراض کے ماتحت انجام دیا گیا تھا۔ لہٰذا آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس جمود وخمود کی زنجیروں کو توڑا جائے اور باب اجتہاد کو کھول کر اس کی آبیاری کی جائے اور نئے پیدا شدہ مسائل کو نئے انداز فکر سے حل کرنے کی کامیاب کوشش کی جائے۔ اس حقیقتِ ثابتہ کا اعتراف علماء اہلسنت نے بھی کیا ہے (ملاحظہ ہو الفلسفۃ السیاسیۃ للاسلام۔ للدکتور عبدالصائم الانصاری۔ الوحدۃ الاسلامیہ للشیخ محمد رشید رضا المصری)

(۷) آیا ائمہ اربعہ کے اصول و اجتہاد میں تغیر و تبدل جائز ہے؟

ہاں جائز ہے اور یقیناً جائز ہے۔ اور اس کی وجہ عنوان نمبر ۵ کے ذیلی بیان حقیقت ترجمان سے بالکل واضح و عیاں ہے۔ لہٰذا اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ مقام مذکور کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۸) ایک مجتہد میں کن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے؟

مجتہد جامع الشرائط میں چند اوصاف جلیلہ و جمیلہ کا پایا جانا ضروری ہے (۱) بلوغ (۲) عقل (۳) علوم آلیہ از قسم صرف و نحو، معانی و بیان و ادب اور اصولِ فقہ وغیرہ کی معتدبہ ضروری مقدار اور قدرے منطق۔ اور اسلامی علوم از قسم تفسیر و حدیث اور فقہ میں کامل دسترس و مہارت (۴) ملکۂ استنباط و استخراج احکام جو کہ ایک لطیفۂ ربانیہ و مواہبت الٰہیہ ہے جس کے حصول کے لیے مذکورہ بالا صفت کے علاوہ کچھ اور صفات جلیلہ از قسم تخلق باخلاقِ عالیہ و تخلّی از رذائلِ نفسانیہ ضروری ہے۔ (ذٰلك فضل اللّٰه یؤتیه من یشاء) (۵) علاوہ بریں مرجع تقلید (جس کی دوسرے تقلید کریں) ہو جس میں اِن امور کا ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے (ا) مرد ہونا (ب) آزاد ہونا۔ (ج) عادل ہونا۔ کیونکہ عورت، غلام اور فاسق و فاجر کی تقلید جائز نہیں ہے۔

(۹) اجتہاد کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

اس کا صحیح طریقہ کار یہ ہے۔ کہ جب کوئی نیا مسئلہ درپیش ہو تو مجتہد کو چاہیے سب سے پہلے قرآن اور اس کے بعد سنّت کی طرف رجوع کرے اگر ان میں کوئی نص صریح مل جائے تو فبہا ورنہ قرآن و سنّت کے کلیات پر نظرِ غائر ڈال کر دیکھے کہ یہ جزئی کس کلی کے تحت آتی ہے؟ کس قاعدہ کلیہ کے ضمن میں مندرج ہے؟ اور یہ خصوصی مسئلہ کس عمومی مسئلہ کے ذیل میں آتا ہے؟ اس سلسلہ میں متشرعہ کے عرف اور اہلِ علم و دین

کے مرتکزات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر پیشوایانِ دین کا ارشاد ہے "علینا القاء الاصول و علیکم ان تتفرعوا" اصول اور قواعدِ کلیہ پیش کرنا ہمارا کام ہے اور ان سے فروعی احکام استنباط کرنا تمہارا کام ہے! (ارشادِ امام جعفر صادقؑ)

(۱۰) اسلامی ریاست میں اجتہاد کو قانون کا مرتبہ کس طرح حاصل ہوگا؟

بادی النظر میں اس کا آسان طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلام کے تمام مکاتبِ فکر کے صاحب الرائے (یعنی ملکہ استنباط رکھنے والے) چند اعلام کی حکومتی سطح پر ایک کمیٹی تشکیل دی جائے اور وہ تمام نئے پیش آمدہ مسائل پر آزادانہ فضا میں مکمل غور و فکر کریں اور جس نتیجہ پر پہنچیں اس کی سفارش حکومت کو پیش کریں اور حکومت اپنے خصوصی اختیارات کی بنا پر اسے قانون کا درجہ دے کر نافذ کرے۔ واللہ سبحانہٗ ولی التوفیق و بیدہ ازمۃ التحقیق۔ وما علینا الا البلاغ

حافظ صلاح الدین یوسف ایڈیٹر الاعتصام لاہور

آپ کے سوالات کا مختصر جواب حسب ترتیب پیش خدمت ہے۔

سوال: اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل کیا ہے۔

جواب: ایک شخص جب قبولیت اسلام کا اعلان کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ اَسْلَمْتُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اللہ کے سامنے سرفگندہ ہو جانے کے بعد ایک مسلمان کی اپنی مرضی اور خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ اب وہ ہر بات میں اللہ کے حکم کا تابع ہے۔ ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العٰلمین۔ (الانعام)

اور اللہ تعالیٰ نے اپنی پسند و ناپسند کی وضاحت قرآن کریم اور صاحب قرآن کریم نبیٔ آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے فرما دی ہے۔ گویا مسلمان کے لیے دو ہی چیزیں واجب الاطاعت ہیں ایک قرآن کریم اور دوسری حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ نبیؐ کی اطاعت کو خود اللہ نے اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ مَن یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ غیرھا من آیات۔

علاوہ ازیں مسلمان کو یہ تاکید کر دی گئی ہے کہ شرعی احکام میں اس کے اپنے ارادے اور اختیار کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اسے ہر معاملے میں بہر صورت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی اطاعت و فرمانبرداری کرنی ہے۔

ماکان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی الله ورسوله امرا ان یکون لهم الخیرة من امرهم۔ الآیة (الاحزاب: ۳۶)

اور فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ (النساء: ۶۵)

اس اعتبار سے اسلام میں اصل قانون ساز (شارع) صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہ ... رمضر

یہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانونِ حیات (قرآنِ کریم) کے اجمال کی تفصیل، ابہام کی تفسیر و تشریح اور اطلاق کی تقیید بحکم قرآنی وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (النحل: ۴۴) فرمائی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تشریح قرآنی، جسے قرآن اُسوہ حسنہ سے بھی تعبیر کرتا ہے، اللہ کی مرضی کی نمائندگی اور اس کی تکمیل کرتی ہے۔ اس لئے اب قرآنِ کریم اور نمونۂ محمدی (قول و فعل رسولؐ) ان دونوں کے مجموعے کا نام شریعت ہے اور یہی شریعت اسلامیہ ایک مسلمان کے لیے سب سے برتر قانون ہے جسے نظر انداز کر کے یا جس کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکتی۔ اب مسلمان اس بات کا پابند ہے کہ جو نظامِ زندگی قرآن و حدیث میں اس کے لیے متعین کر دیا گیا ہے، اس سے کسی قسم کا انحراف نہ کرے، یہی اسلام کا تقاضا اور ایمان کا مطالبہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک مسلمان تمام شعبہ ہائے حیات میں قرآن و حدیث کی ہدایات و احکام کا پابند ہے اور اس سے یک سرمو انحراف کی اسے اجازت نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سرے سے قانون سازی کا مجاز ہی نہیں ہے اور ایک اسلامی ریاست میں قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آ کر مذکورۃ الصدر سوال کا جواب ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں قانون سازی کی گنجائش تو ضرور ہے، لیکن مغربی جمہوری ریاستوں کی طرح اس میں قانون سازی کا یہ حق غیر محدود نہیں، محدود ہے۔ مغرب کے جمہوری نظام میں قانون سازی کا یہ حق عوام کو حاصل ہے، ان کی اکثریت جس چیز کو پسند یا ناپسند کرے گی، اس کو قانون کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن ایک اسلامی ریاست میں قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تسلیم کیا گیا ہے، اس لئے وہاں کے مسلم عوام اللہ کی پسند و ناپسند کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر کوئی قانون سازی نہیں کر سکتے۔ وہاں قانون سازی کا دائرۂ عمل محدود و متعین

چنانچہ اسلامی معاشرہ وریاست میں حسبِ ذیل صورتوں میں قانون سازی کی گنجائش ہے۔

۱- جن معاملات کے بارے میں شریعت بالکل خاموش ہے نہ براہِ راست ان کے متعلق کوئی حکم ہے اور نہ اُن سے ملتے جلتے معاملات ہی کے متعلق کوئی ہدایت ملتی ہے۔

۲- ایسے معاملات جن کے بارے میں اگرچہ کوئی شرعی نص نہیں ہے لیکن ان سے ملتے جلتے معاملات کے بارے میں شریعت کا حکم موجود ہے۔

اوّل الذکر معاملات میں اس انداز سے قانون سازی کی جائے گی جو اسلام کی رُوح اور اس کے اصولِ عامہ سے مطابقت رکھتی ہو گی۔

ثانی الذکر معاملات میں قانون سازی کی صورت یہ ہو گی کہ احکام کی علّتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اُن تمام معاملات میں ان کو جاری کیا جائے گا جن میں وہ علّتیں پائی جائیں گی اور ان معاملات کو ان سے مستثنیٰ ٹھہرایا جائے گا جن میں وہ علّتیں نہیں پائی جاتیں۔

۳- علاوہ ازیں ایک تیسری قسم قانون سازی کی یہ بھی ہے کہ اسلامی احکام کی تدوینِ نو کی جائے اور ہر ہر باب کو شق وار اور دفعہ وار مرتب کیا جائے جس طرح کہ آج کل کے دساتیر اور قوانین ہیں۔ جب کسی اسلامی ریاست میں اسلام کو نافذ کیا جائیگا تو اس انداز کی تدوینِ نو اور قانونسازی ناگزیر ہے۔

سوال ۱۲: اس دائرہ عمل میں اجتہاد کو کیا مقام حاصل ہے؟

جواب۔ غیر منصوص معاملات میں شارع کی مرضی ومنشا کے مطابق قانون سازی ہی کا نام قیاس واستنباط اور اجتہاد ہے، جس کی ضرورت عہدِ صحابہؓ بلکہ عہدِ رسالت سے اب تک مُسلّم ہے۔ جب اجتہاد ایسی اہم چیز ہے کہ ہر دور میں اس کی ضرورت ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کا مقام بھی بہت اُونچا ہے۔ اس لئے اجتہاد کو فقہ اسلامی کی رُوح اور اس کے لئے سرچشمۂ حیات قرار دیا جائے تو بجا ہے کیونکہ اجتہاد کو مقصدِ اسلام اور اس کے خصائص کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اسلام کے مقصد اور اس کی خصوصیات کو سمجھ لیا جائے اس کے بعد اجتہاد کی اہمیت اور اس